

برطانوی مستشرقین کے ہندوستانی (اردو) نثری متون کے تراجم اور تدوین: تحقیقی تناظر
(انیسویں صدی کے حوالے سے)

**"British Orientalists' Translations and Editorial work on Indian (Urdu)
Prose Texts: A Research Perspective (With Reference to the 19th Century)**

Prof. Dr. Naseem Abbas Ahmar

Department of Urdu Language and Literature, University of Sargodha

naseem.abbas@uos.edu.pk

KEYWORDS

Orientalists
19th Century
Translations
Bagh-o-Bahar
Tota Kahani
Glossaries
Colonial
Eastern Literature
Bagh-o-Bahar

DATES

Received 23-05-2025
Accepted 10-06-2025
Published 30-06-2025

QR CODE



ABSTRACT

In the 19th century, a critical evaluation of the services rendered by Orientalists holds significant importance. To secure and prolong their rule over India, it was deemed necessary for the British to acquire deep knowledge of Indian civilization, culture, customs, and local languages. For this purpose, the Curricula were developed specifically to teach these local languages, and texts were prepared to meet these academic requirements. The texts translated into English by Orientalists were mostly those that had been published under the auspices of Fort William College and had become part of the academic curriculum. In these translations, the primary objective of attention and effort was to make the content accessible and convenient for students. Among the prose tales that were translated and edited are: *Bagh-o-Bahar*, *Tota Kahani*, *Mazhab-e-Ishq*, *Khiraad Afroz*, *Baital Pachisi*, *Mirat-ul-Uroos*, *Taubat -un-Nasuh*. In the edited texts, alongside the Urdu script, Roman transliterations and glossaries were also provided. However, some Orientalists also elaborated on the significance of these texts. In certain cases, a colonial perspective emerged regarding the nature and purpose of these works. At times, Eastern literature and knowledge were appreciated, while at other times they were portrayed as superstitious, ignorant, or lacking in insight. This study also reveals that among Orientalists, there existed conflicting and diverse views regarding Indians and Eastern knowledge and literature.

<https://journals.mehkaa.com/index.php/negotiations/article/view/146>

تلخیص:

انیسویں صدی میں مستشرقین کی طرف سے پیش کردہ خدمات کا تنقیدی جائزہ بہت اہمیت رکھتا ہے۔ ہندوستان پر اپنی حکمرانی کو محفوظ اور طول دینے کے لیے، انگریزوں کے لیے ہندوستانی تہذیب، ثقافت، رسم و رواج اور مقامی زبانوں کے بارے میں گہرا علم حاصل کرنا ضروری سمجھا گیا۔ اس مقصد کے لیے، نصاب کو خاص طور پر ان مقامی زبانوں کو سکھانے کے لیے تیار کیا گیا تھا، اور ان تعلیمی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے نصاب تیار کیے گئے تھے۔ مستشرقین کی طرف سے انگریزی میں ترجمہ شدہ تحریریں زیادہ تر وہ تھیں جو فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام شائع ہوئی تھیں اور تعلیمی نصاب کا حصہ بن چکی تھیں۔ ان تراجم کا بنیادی مقصد طلباء کے لیے مواد کو آسان اور عام فہم بنانا تھا۔ جن نثری کہانیوں کے تراجم اور تدوین کا کام کیا گیا ان میں شامل باغ و بہار، توتا کہانی، مذہب عشق، خرد افروز، بیتل پچھنی، مرآة العروس، توبت النصوح شامل ہیں۔ ان تراجم میں اردو رسم الخط کے ساتھ ساتھ رومن ٹرانسلیٹریشن اور فراہنگ بھی فراہم کی گئی۔ تاہم بعض مستشرقین نے ان متون کی اہمیت کو بھی بیان کیا ہے۔ بعض صورتوں میں، ان کاموں کی نوعیت اور مقصد کے حوالے سے نوآبادیاتی نقطہ نظر سامنے آیا۔ بعض اوقات مشرقی ادب اور علم کو سراہا جاتا تھا، جب کہ بعض اوقات انہیں توہم پرست، جاہل یا بصیرت سے عاری کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔ اس مطالعہ سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ مستشرقین کے درمیان ہندوستانیوں اور مشرقی علم و ادب کے بارے میں متضاد اور متنوع نظریات موجود تھے۔

لیوس فرینڈلڈ سمٹھ (LEWIS F. SMITH) نے ۱۸۱۱ء میں انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کی مزید اشاعتوں میں ۱۸۲۵ء، ۱۸۵۰ء، ۱۸۸۳ء اور ۱۸۹۵ء شامل ہیں۔ شروع میں مترجم کا دیباچہ شامل ہے۔ انھوں نے دیباچے میں گلگرسٹ کے اردو زبان پر احسانات کو بیان کیا ہے۔ گلگرسٹ کی محنت، جوش اور ہنر نے اس زبان سے یورپیوں کو آشنا کیا۔ 'باغ و بہار' کو فورٹ ولیم کالج کا اہم اور کلاسیکی کام قرار دیا ہے۔ ان کے نزدیک "باغ و بہار" کی دلچسپ کہانی، مشرقی آداب، ہندوستانیوں کی سوچ کے زاویے، عام بول چال کی زبان اور محاوروں کے علم کا ذریعہ ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ مشرقی داستانوں میں مذہبی عقائد اور اخلاقیات کے بیانات کو نامکمل نظریات، لاعلمی اور توہم پرستی کا مرقع قرار دیتے ہیں۔ بادشاہوں اور شہزادوں کے سامنے سجدہ ریزی کو ایشیائی غلام ذہنیت سے تعبیر کرتے ہیں۔ اپنے مذکورہ ترجمے کو لفظی اور مصنف کی سوچ سے ہم آہنگ کہا ہے۔ اور ایسی زبان میں منتقل کرنے کی بات کی ہے کہ جو خواتین بھی پڑھ سکتی ہیں۔ وہ اس بات کا ذکر بھی کرتے ہیں کہ ہندوستان پر حکومت کرنے کے لیے انگریز افسران کو اس زبان (جو لاہور سے چٹاگانگ، ہردوار سے کیپ مورین تک پورے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے) اور جہاں کے رسم و رواج کو سمجھنا از بس ضروری ہے۔ ترجمے کے ساتھ ساتھ اپنے دیے گئے حواشی کی اہمیت بھی پیش کی ہے۔ مشرقی داستانوں اور قصوں کے حوالے سے ان کی رائے ملاحظہ کیجیے:

برطانوی مستشرقین کے ہندوستانی (اردو) نثری متون کے تراجم اور تدوین: تحقیقی تناظر

"اگر ہم یہ بات ذہن میں رکھیں کہ کوئی بھی ایشیائی (مشرقی) ادیب، خواہ وہ تاریخ لکھے یا داستان، تسلسل اور حقیقت پسندی کا کبھی پابند نہیں رہا۔ سچائی کی محتاط راہ پر چلنا اور واقعات کو قرین قیاس انداز میں پیش کرنا ان کے منصوبے میں شامل نہیں رہا۔ مشرقی مصنفین کی تحریروں میں — حتیٰ کہ سنجیدہ تاریخی اور اخلاقی مضامین میں بھی — تخیل کی پرواز، دیومالائی عناصر اور غیر فطری مناظر عام پائے جاتے ہیں۔" (1)

مذکورہ ترجمہ ۱۵۸ صفحات میں دیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں ضمام دیے گئے ہیں۔ ان ضمام میں مترجم کے اپنے چار خطوط ہیں جو یورپ میگزین اور اینوکل ایشانک رجسٹر میں شائع ہو چکے تھے۔ ان خطوط کی خاص بات اس عہد کے رسوم و رواج اور رویوں کا بیان ہے۔ خطوط کا سن تحریر کچھ یوں ہے:

پہلا خط: ۲۰ جنوری ۱۸۹۴ء، لکھنؤ

دوسرا خط: ۲۸ فروری ۱۸۹۵ء، لکھنؤ

تیسرا خط: ۱۱ مارچ ۱۸۹۵ء، لکھنؤ

چوتھا خط: یکم مئی ۱۸۰۱ء، دہلی

اس ترجمے کی بعد کی اشاعتوں پر ڈنکن فاربس (DUNCAN FORBES) نے بھی نظر ثانی کی۔ نظر ثانی شدہ اشاعت میں ڈنکن فاربس نے اس ترجمے میں کی گئی اصلاحوں کو دیا چے میں پیش کر دیا ہے۔ مثال کے طور پہ پہلے اور دوسرے درویش کی کہانی کے بعض ترجموں کے جملے، حواشی میں تبدیلیاں اور اضافے وغیرہ۔

ڈنکن فاربس نے ۱۸۴۶ء میں 'باغ و بہار' کو مرتب کیا۔ اس کی دیگر اشاعتوں میں ۱۸۴۹ء، ۱۸۵۹ء، ۱۸۶۰ء، ۱۸۶۲ء اور ۱۸۷۳ء شامل ہیں۔ سرورق پہ اردو رسم الخط میں اس داستان کی افادیت کے حوالے سے دو جملے بھی تحریر کیے گئے ہیں۔ اس مرتبہ نسخے کا دیباچہ انگریزی میں لکھا گیا ہے۔ اس دیباچے میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازمین کے لیے 'باغ و بہار' کی نصابی اہمیت کو واضح کیا ہے۔ جو نیر افسران، فوجی اور میڈیکل کے ملازمین کے لیے ہندوستانی کا امتحان پاس کرنا ضروری امر تھا۔ ڈنکن فاربس نے ۳۱ مئی ۱۸۴۴ء کے امتحانی پیپر میں 'باغ و بہار' سے ترجمے کے لیے عبارات کی مثالیں بھی دی ہیں۔ اس کے بعد 'باغ و بہار' کو امیر خسرو کی تصنیف قرار دیا ہے۔ امیر خسرو کی تصنیفات و تالیفات پر بھی تفصیل رقم کی ہے۔ اس ایڈیشن کی ترتیب کے لیے انھوں نے ۱۸۰۳ء والی اشاعت کو بنیاد بنایا ہے۔ اس مرتب ایڈیشن میں ڈنکن فاربس نے رموز او قاف کا بھی اہتمام کیا ہے اور دیباچے میں رموز او قاف کے اہتمام کی ضرورت و اہمیت پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ داستان کا متن اردو رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ اور آخر پہ اس داستان کی فرہنگ بھی پیش کی گئی ہے۔ اردو الفاظ کے انگریزی مفہوم کو پیش کیا گیا ہے۔ اس بنا پر یہ مرتبہ نسخہ اہمیت کا حامل ہو گیا ہے۔ ۱۸۵۹ء والے ایڈیشن میں داستان رومن میں لکھی گئی ہے اور آخر پہ فرہنگ میں الفاظ کا اندراج بھی رومن میں ہے اور ان کا مفہوم

انگریزی میں پیش ہوا ہے۔ اس اشاعت کے دیباچہ میں رومن میں ترتیب دینے کے حوالے سے گلگرسٹ کی رومن تحریر کی اہمیت کو بھی موضوع بنایا ہے۔ اس نسخے کے سرورق پہ رومن میں یہ شعر درج ہے۔

Khata gar kahin ho, to rakhyo muaf

Ki phulon men posheda rehta hai khar

چوتھا ایڈیشن ۱۸۶۰ء میں سامنے آیا۔ اس میں پہلے ایڈیشن کی طرح ہی اردو رسم الخط اپنایا گیا ہے البتہ اس بار فرہنگ کو شروع میں اور داستان کا اصل متن بعد میں دیا گیا ہے۔ چوتھے ایڈیشن میں رموز و اوقاف پر بھی نظر ثانی کی گئی ہے۔ ڈکنن فاربس نے ۱۸۵۷ء میں اس کا انگریزی ترجمہ پیش کیا البتہ اس کا دیباچہ ایل ایف سمٹھ کے ترجمہ والے ایڈیشن میں شامل دیباچے میں سے ہی منتخب شدہ ہے۔

ڈبلیوسے ہولنگز (W.C. HOLLINGS) نے طالب علموں کے لیے اس کا انگریزی ترجمہ ۱۸۵۱ء میں کیا۔ اس ترجمے میں ایک صفحے کا دیباچہ لکھا گیا ہے۔ ترجمے کی بابت معلومات بہم پہنچائی گئی ہیں کہ: اصل متن کے قریب رکھا ہے، زیادہ مقامات پر لفظی ترجمہ سے کام لیا ہے تاکہ طالب علم لغت اور صرف و نحو کی مدد سے انگریزی ترجمے کو دوبارہ اردو میں منتقل کرنے کی مشق کر سکیں، نیز پھر اپنی کوشش کو اصل متن سے ملا کر اپنی غلطیاں درست کر سکیں۔ ان کے نزدیک زبان سیکھنے کا اس سے بہتر اور سادہ طریقہ کوئی اور نہیں ہے، اور اگر کوئی طالب علم چند مہینے اس طریقے کو استقامت سے اپنائے، تو وہ الفاظ، محاورات، زبان کی ساخت اور طرزِ اظہار میں کافی مہارت حاصل کر سکتا ہے۔

ایڈورڈ ایسٹ وک (EDWARD B. EASTWICK) نے باغ و بہار کا انگریزی ترجمہ ۱۸۵۱ء میں کیا۔ دیباچے کے ساتھ ساتھ متن کے حواشی بھی دیے ہیں۔ یہ کتاب ۱۸۷۷ء میں بھی شائع ہوئی۔ ایسٹ وک اپنے ترجمے کو پہلا ترجمہ قرار دیتے ہیں کیوں کہ ان کے نزدیک لیوس فرڈینینڈ اسمتھ کا ۱۸۱۱ء کا ترجمہ نہیں بلکہ اسے آزاد ترجمہ کہا جاسکتا ہے۔ اس میں تمام مشکل فقروں کو سرسری انداز میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ علاوہ ازیں، اصل کتاب میں شامل اشعار کو ایسی بے کیف اور بے سُر صورت میں پیش کیا گیا تھا کہ ایک عام قاری ترس کھا کر بھی ایک سطر سے زیادہ پڑھنے کو آمادہ نہ ہو۔ اس کے بعد وہ ترجمے کے جواز اور اہمیت کو واضح کرتے ہیں۔ ان کے مطابق ترجمہ زبان سیکھنے میں مددگار ہوتا ہے۔ ترجمہ سے مترجمہ متن کا مجموعی خاکہ بھی ذہن میں آجاتا ہے۔ اپنے ترجمے کی افادیت بھی بیان کرتے ہیں کہ مشرقی کتابوں میں اکثر ابواب یا فہرست مضامین کی عدم موجودگی کے باعث مشکل پیش آتی ہے۔ اس کمی کو دور کرنے کے لیے اس ترجمے کے ساتھ ایک "فہرست مضامین" بھی شامل کی گئی ہے۔ ایسٹ وک نے 'باغ و بہار' اور 'امیر امن' اور 'امیر خسرو' کا تعارف بھی بیان کیا ہے۔ انھوں نے 'باغ و بہار' کی کچھ خامیاں بھی نمایاں کی ہیں۔ ان کے نزدیک اس میں کئی ایسے نحوی (گرامری) سقم موجود ہیں جو آج کے معیارات پر غلط سمجھے جائیں گے۔ جیسے کہ واحد و جمع کی عدم مطابقت، جملوں کی ترتیب میں خامیاں، اور عربی و فارسی جملوں کی بے محل آمیزش وغیرہ۔ اردو زبان کا مزاج طویل جملوں کو چھوٹے اور واضح فقروں

برطانوی مستشرقین کے ہندوستانی (اردو) نثری متون کے تراجم اور تدوین: تحقیقی تناظر

میں بانٹنے کا ہے، لیکن بعض جگہوں پر مصنف نے کئی سطروں پر مشتمل جملے لکھ دیے ہیں جو غیر فصیح معلوم ہوتے ہیں۔ 'باغ و بہار' کی اہمیت اور مشرقی لوگوں کے بارے تاثر دیکھیے:

"اس" رومانوی داستان "کی پانچ کہانیوں میں سے سب سے زیادہ اہمیت جس کہانی کو دی گئی ہے، وہ بادشاہ آزاد بخت کی داستان ہے۔ اور یہ بالکل بجا ہے، کیونکہ اس کہانی میں "الف لیلہ (Arabian Nights) کی بعض کہانیوں سے قریبی مشابہت پائی جاتی ہے، اور دلچسپی کے اعتبار سے وہ ان سے کسی طور کم نہیں۔ باغ و بہار کا مطالعہ، جہاں زبان سیکھنے والے طالب علم کے لیے لسانی ترقی کا ذریعہ ہے، وہیں یہ کتاب ہندوستان کے باشندوں کے طور طریقوں، عادات، اور جذبات کے بارے میں بھی نہایت مفید معلومات فراہم کرتی ہے۔ اگرچہ جس کتاب کا یہ ترجمہ ہے، وہ پانچ صدیوں پہلے لکھی گئی تھی، مگر مشرقی اقوام کی جامد و موروثی فطرت ایسی ہے کہ آج بھی یہ کتاب مشرقی زندگی کی ایک نہایت روشن اور حقیقی جاگتی تصویر پیش کرتی ہے۔" (2)

جے ایف بین ایس (J.F. BANAS) نے ۱۸۸۷ء میں "باغ و بہار میں سے انتخابات" شائع کی۔ اس انتخاب میں، اردو اور رومن دونوں رسم الخط کے ساتھ ان کے انگریزی تراجم متوازی انداز میں کالم کی صورت پیش کیے گئے ہیں۔ ایڈتھ ایف پیری نے ۱۸۹۰ء میں اس کا انگریزی ترجمہ شائع کیا۔ اس میں بھی مختصر دیباچہ پیش کیا گیا ہے۔ یہ ترجمہ بھی طالب علموں کی آسانی کے لیے کیا گیا ہے۔ جس کی مدد سے وہ مشرقی محاوروں، فقروں اور کہانی کے بنیادی واقعات کو سمجھ سکیں۔ پیری نے اس داستان کے مشکل ہونے کی بھی وضاحت کی ہے کہ اس میں ایک کہانی اکثر دوسری کہانی کے اندر داخل ہوتی چلی جاتی ہے، اور ان سب کے درمیان مشابہت الجھن میں ڈال دیتی ہے۔ اس ترجمے میں کہانیوں کے خلاصے بھی پیش کیے گئے ہیں۔

ولیم کارمائیکل سمٹھ (WILLIAM CARMICHAEL SMYTH) نے ۱۸۲۱ء میں لولال جی کی "اطائف ہندی" کو از سر نو مرتب کیا۔ اس میں دیباچے کے بعد ۸۶ نقلیات کو اردو اور رومن رسم الخط میں دیا گیا ہے۔ ایک صفحہ اردو رسم الخط اور اگلا صفحہ اسی متن کے رومن رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ اصل نسخے کے ساتھ ایک اشاریہ بھی منسلک تھا، جس میں کہانیوں میں آنے والے اہم الفاظ اور ان کا انگریزی ترجمہ درج تھا۔ اس مرتب نسخہ میں اسے شامل نہیں کیا گیا۔ اس میں انھوں نے میر افضل علی کی مدد سے کہانیوں کا بغور جائزہ لیا ہے اور جہاں ضروری سمجھا، وہاں اصل متن کی معمولی اصلاح بھی کی ہے۔ کچھ کہانیاں جن میں سنسکرت یا برج بھاشا کے دوہے شامل تھے، انہیں مکمل طور پر نکال دیا گیا ہے اور اسے خارج کرنے کی وجہ یہ بتائی ہے وہ ابتدائی طلبہ کے لیے بہت مشکل تھے۔ وہ رومن رسم الخط کے حوالے سے اپنے نقطہ نظر اور اصول یوں واضح کرتے ہیں:

"میر اپنٹہ یقین ہے کہ کسی مشرقی زبان کی درست تلفظ سیکھنے کے لیے سب سے مؤثر طریقہ یہ ہے کہ اسے رومن رسم الخط (انگریزی حروف) میں پڑھا جائے۔ لہذا ہر کہانی کا ایک رومن نسخہ اصل متن کے ساتھ صفحے کے بالمقابل شامل کیا گیا ہے، تاکہ جب بھی طالب علم کسی جگہ الجھن محسوس کرے، تو فوراً

ایک نظر میں صحیح تلفظ معلوم کر سکے۔ اس طریقے سے الفاظ پر اعراب (زبر، زیر، پیش وغیرہ) لگانے کی بھی ضرورت باقی نہیں رہتی، جن کی غیر موجودگی کا عادی ہو جانا ضروری ہے، کیونکہ نہ تو وہ اکثر مخطوطات میں پائے جاتے ہیں اور نہ ہی اکثر مطبوعہ کتب میں۔" (3)

تھامس روبک (THOMAS ROEBUCK) نے ۱۸۱۵ء میں میر شیر علی افسوس کی "مذہب عشق" کا دوسرا ایڈیشن مرتب کیا۔ یہ ہندوستانی پریس کلکتہ سے اشاعت پذیر ہوا۔ سرورق پر دو اشعار اردو رسم الخط میں دیے گئے ہیں۔ اس کا دیباچہ اٹھارہ صفحات پر مبنی ہے۔ دیباچے میں اس داستان کی شہرت کی دو وجوہات بیان کی گئی ہیں کہ ایک تو یہ مقامی مصنف نے تحریر کی ہے دوسرا اس کا قصہ تخیلی سطح پر دلکش اور نثر خوب صورت ہے۔ وہ اس داستان کو باقی مشرقی داستانوں کی تین خصوصیات؛ حیرت، تخیل اور آزاد خیالی کا مرقع خیال کرتے ہیں۔ مصنف نے چوں کہ ہندوؤں کے درمیان پرورش پائی اس بنا پر ان کے قصے میں کچھ ہندو عقائد بھی موجود ہیں۔ مثال کے طور پر تاسخ اور ہندو دیوتا اندر کا بیان۔ وہ اس داستان کے اردو قالب میں ڈھالنے والے مترجم نہال چند لاہوری اور ترجمے کی خصوصیات بھی بیان کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس اردو ترجمے کا مقصد اردو زبان کی درست اور شفاف تعلیم کو فروغ دینا ہے۔ اسی لیے اس ترجمے میں کہ اصل متن سے لفظ بہ لفظ مطابقت کی بجائے اسلوب کی پاکیزگی کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے۔ داستان میں موجود مشرق کے مختلف تصورات کی وضاحت اور تاریخی تناظر بھی پیش کرتے ہیں۔ مثال کے طور پہ 'ارم اشداد، سام، قوم عاد وغیرہ۔ تھامس روبک اس داستان کے دیباچہ میں مختلف فلسفیانہ مباحث کا مشرق اور مغرب سے تقابل بھی پیش کرتے ہیں۔ اس سے تھامس روبک کے اپنے مطالعہ اور دلچسپی کا اندازہ بھی لگایا جاسکتا ہے:

"کہانی کے ہر واقعے کے ساتھ چند فکری اور فلسفیانہ تشریحات بھی شامل کی گئی ہیں، جن میں ان کے پوشیدہ یا روحانی معانی بیان کیے گئے ہیں۔ یہ تشریحات اس فلسفے کے اصولوں پر مبنی ہیں، جو فارسیوں کے صوفیا اور ہندوؤں کے ویدانتی پیش کرتے ہیں۔ اسی قسم کا فلسفہ قدیم یونانی فلسفہ دانوں، خاص طور پر افلاطونی مکتب فکر میں بھی نظر آتا ہے، اور اس کی ایک خوبصورت جھلک ورجیل (Virgil) کی کتاب اینیڈ (Aeneid) کی چھٹی کتاب میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اس فلسفے اور اس کے مشرقی ادباء میں استعمال کی مکمل وضاحت سرولیم جونز کے ایک مقالے میں موجود ہے، جو انہوں نے فارسی و ہندی صوفی شاعری پر لکھا۔ مصنف نے انسان کی برتری کے نظریے کو جس انداز سے بیان کیا ہے، اس کی ایک جھلک درج ذیل اقتباس میں نظر آتی ہے 'جان لو کہ صوفیاء ہر روحانی مخلوق کی نوع کو اس مقام کے طور پر دیکھتے ہیں جہاں اللہ تعالیٰ کے کسی نہ کسی نام یا صفت کا ظہور ہوتا ہے۔ اور یہ نظر آنے والی دنیا اس روحانی دنیا کا عکس ہے۔ لہذا کائنات کا ہر ذرہ ابدی نور کی ایک کرن سے روشن ہے، اور ازلی فیض کی ایک بوند

سے سیراب ہے۔'

سعدی فرماتے ہیں:

'عاقل ہر پتے میں خالق کی تعریف کی ایک سطر پڑھ لیتا ہے۔' اس دنیا میں انسان وہ مخلوق ہے جس کے لیے ہر فانی چیز مسخر ہے، اور وہ اپنے علم میں تمام موجودات کی حقیقت کا احاطہ کرتا ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مادہ ازل سے موجود ہے، کیوں کہ جو جاننے والا ازل سے ہے، اس کی معرفت بھی ازلی ہونی چاہیے۔" تاہم، لاک، بیکن، اور نیوٹن کے پیروکار اس منطق کو زیادہ وزنی نہیں سمجھیں گے۔ لیکن انسانی ذہن کی تاریخ کے طالب علم کے لیے یہ نہایت دلچسپ موقع ہو گا کہ وہ مشرقی اہل علم کی استدلالی مہارت کو ایسے نازک نکات پر آزما دیکھیں، جو کبھی خود مغرب کے مدارس فلسفہ کا مشغلہ رہے، یہاں تک کہ مذکورہ بالا عظیم مفکرین نے سچائی کی نئی راہیں کھولیں اور انسانوں کی توجہ زیادہ مفید اور عملی علوم کی طرف موڑ دی۔" (4)

۱۸۵۲ء میں ڈنکن فاربس نے "توتا کہانی" کو مرتب کیا۔ "توتا کہانی" اور 'باغ و بہار' کو ایسٹ انڈیا کمپنی کی سروس میں براہ راست نامزد کیدٹس کے امتحان کے لیے نصاب کی کتابوں کے طور پر منتخب کیا گیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان داستانوں کے تراجم اور مرتبہ نسخے زیادہ تعداد میں سامنے آئے۔ ڈنکن فاربس نے اس مرتبہ اشاعت میں مختصر دیباچے کے بعد فرہنگ بھی دی ہے۔ فرہنگ کی تیاری میں ان کے دوست چارلس ریونے کردار ادا کیا۔ فرہنگ کے بعد داستان کے اصل متن کو اردو رسم الخط میں پیش کیا گیا ہے۔ انھوں نے مختصر دیباچے میں مذکورہ داستان کے اصل ماخذ اور اس کے مختلف تراجم کی تفصیل پیش کی ہے۔ یہ داستان اصل میں سنسکرت زبان میں لکھی گئی تھی اور اس کا عنوان "شک سپتتی" تھا، یعنی "طوطے کی ستر کہانیاں"۔ کم از کم پانچ صدیاں قبل، ان میں سے باون کہانیوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا، جس کا نام "توتی نامہ" رکھا گیا ضیا الدین خنشی کا فارسی ترجمہ مقبول ہوا بعد ازاں آسان فارسی میں اسے محمد قادری نے ڈھالا اور کہانیوں کی تعداد ۳۵ تک محدود کر دی اور اسی فارسی نسخے سے حیدر بخش حیدری نے اردو ترجمہ کیا۔ فاربس نے دیباچے کے حواشی میں ضیا الدین خنشی کا بھی تحقیقی تعارف پیش کیا ہے۔ داستان کی خصوصیات کے بیان کے لیے گلکرسٹ کے بیان کو دیباچہ میں شامل کیا ہے۔ اس کا ایک مزید ایڈیشن ۱۸۶۲ء میں شائع ہوا۔

جارج سماں (GEORGE SMALL) نے ۱۸۷۵ء میں "توتا کہانی" کا انگریزی ترجمہ کیا۔ اس کا طویل دیباچہ بھی تحریر کیا۔ انھوں نے اس کتاب کی مقبولیت اور ہندوستان کی تمام زبانوں کی اشاعت کو سراہا ہے مگر ان تراجم کو مختصر اور مسخ شدہ قرار دیا ہے۔ سنسکرت الاصل اس داستان کے پہلے فارسی ترجمہ کا سن ۱۳۳۰ء بتایا ہے، جو ضیا الدین خنشی نے کیا۔ جارج سماں داخلی شہادت سے کام لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ خنشی نے اپنے فارسی ترجمہ میں بہت سے عربی اشعار اور امثال کا استعمال کیا ہے جس سے یہ خیال ابھرتا ہے کہ اس کا عربی ترجمہ بھی ہو چکا ہو گا اور عین ممکن ہے کہ خنشی نے اسی عربی نسخے سے فارسی ترجمہ کیا ہو۔ حیدری والے نسخے میں بہت سے اردو اشعار حیدری کی تخلیق ہیں۔ دیگر شعر کی نشاندہی کے لیے جارج سماں کے دوست، فارسی ادب کے ماہر، سید عبداللہ نے مدد کی ہے۔ چند مشکل اشعار کے حواشی مرتب کرنے میں جان ٹی پلیٹس نے مدد کی۔ اس ترجمے کے مقصد وہ یہ

بیان کرتے ہیں کہ یہ طالب علموں کے علاوہ اس طبقے کے لیے بھی کیا گیا جو مشرقی ادب سے واقفیت میں دلچسپی رکھتا ہے۔ ترجمہ اصل کے قریب اور مشکل اشعار کا لفظی ترجمہ حواشی میں دیا گیا ہے۔ اپنے ترجمے کے ماخذات اور اصولوں کی بابت لکھتے ہیں:

"میرے سامنے جو متون تھے وہ ڈاکٹر گلکرسٹ اور ڈاکٹر فوربز کے مرتب کردہ نسخے تھے۔ پہلا کلکتہ سے ۱۸۳۹ء میں شائع ہوا (لیتھوگراف)، دوسرا لندن سے 1862 میں (طباعت شدہ)۔ ڈاکٹر فوربس نے اپنی طباعت میں کئی ایسے جملے حذف کر دیے تھے جنہیں وہ "مہذب کانوں کے لائق" نہ سمجھتے تھے، اور جو نوجوانوں کے لیے موزوں نہ تھے۔ میں نے بھی وہی جملے حذف کر دیے ہیں۔ جن الفاظ یا جملوں کا اضافہ میں نے ترجمے میں روانی پیدا کرنے کے لیے کیا ہے، یا جو مطلب واضح کرنے کے لیے ضروری تھے۔ مگر وہ جملے جو اصل میں موجود نہیں، انہیں میں نے نوکیلے قوسین میں بند کیا ہے۔ جبکہ گول قوسین () میں وہ جملے یا تو اصل متن میں بطور جملہ معترضہ ہیں، یا کسی لفظ کی وضاحت کے لیے شامل کیے گئے ہیں۔" (5)

۱۸۵۷ء میں ایڈورڈ بی ایسٹ ویک نے حفیظ الدین احمد کی "خرد افروز" مرتب کی۔ اس کا دیباچہ تین صفحات پر مبنی ہے۔ داستان کا متن اردو رسم الخط میں ہے البتہ داستان کے ابواب کی فہرست کا انگریزی ترجمہ بھی دیا گیا ہے۔ مشکل الفاظ کے معانی فٹ نوٹس میں دیے گئے ہیں۔ دیباچہ میں اس ترجمے کی قدر و قیمت کے اندازے کے لیے ایک مثال دی ہے کہ ایسا اردو ترجمہ ہے جس کے لیے حفیظ الدین احمد کو سب سے زیادہ انعامی رقم دی گئی ہے۔ فرانسسیسی مستشرق گارساں دتاسی کی اس داستان کی تعریف کو بھی دیباچہ میں جگہ دی ہے۔ مترجم حفیظ الدین احمد کا تعارف بھی دیا ہے۔ یہ ایسے مترجم ہیں جنہوں نے خود انگریز وارن ہسٹینگز کے کلکتہ میں قائم کردہ کالج میں تعلیم پائی تھی اور ان کے والد بھی فورٹ ولیم کالج میں منشی تھے۔ متن میں حرکات اور دیگر نشانات اعراب کا تعلق کے لیے ڈاکٹر گلکرسٹ کے وضع کردہ نظام کو اپنایا گیا ہے۔ ان حرکات اور علامات اور ان کے استعمال کی تفصیل بھی دی گئی ہے۔

۱۸۵۵ء میں "ہیٹال پچیسپی" کا انگریزی ترجمہ بروک ہارٹ بارک نے کیا اس میں ہندی، اردو رسم الخط اور انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔ بارک نے دیباچے میں ان ہندوستانی حکمرانوں کی تعریف کی ہے جو یورپی ممالک کی جدید سائنسی تحقیقات کو سنسکرت میں ترجمہ کروانے کی کوشش کرتے رہے۔ ان حکمرانوں میں سے ایک راجہ جے سنگھ ساوائی بھی تھے۔ یہ جے پور کے حکمران رہے۔ انھی کے حکم پر سورت کبیسٹور نے سنسکرت الاصل داستان "ہیٹال پچیسپی" کو برج بھاشا میں ترجمہ کیا۔ بارک نے اس داستان کا تقابل انگریزی داستانوں سے بھی کیا ہے اور کہانی کا خلاصہ بھی پیش کیا ہے۔ لفظ بہ لفظ ترجمے کی افادیت کو بیان کرنے کے لیے مشہور مصلح ریورنڈ سڈنی اسمتھ کے قول کو بھی نقل کیا ہے۔ انہوں نے دو طرز پر ترجمہ کیا ہے اول: انٹر لائنسُ ترجمہ (ہر سطر کے نیچے ترجمہ) بالکل لفظ بہ لفظ ہے، دوم: صفحے کے نیچے دیا گیا ترجمہ، ان جگہوں کی وضاحت پر مبنی ہے جہاں انٹر لائنسُ عبارت کچھ پیچیدہ ہو۔ گرامر اور

محاورات کی وضاحت کے لیے چند حواشی (نوٹس) جو شامل کیے گئے ہیں۔ اس اشاعت کا ایک مقصد یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ایسی اشاعت تیار کی جائے جو سابقہ نسخوں کے مقابلے میں کم غلطیوں پر مشتمل ہونی ہندی ترجمے میں حرکات (زیر، زبر، پیش) کی درستگی اور حسن ترتیب کو بھی ملحوظ رکھا جائے۔ دیوناگری رسم الخط میں "بیٹال پچپی" کا متن ۱۸۶۱ء میں ڈکنن فارلس نے مرتب کیا اس کا دیباچہ بھی تحریر کیا اور اسی متن کا انگریزی ترجمہ ۱۸۷۱ء میں جان ٹی پلیٹس نے کیا اور کتاب کا عمدہ دیباچہ بھی پیش کیا۔

۱۸۶۲ء میں ڈکنن فارلس اور ڈاکٹر چارلس ریون نے "انخوان الصفاء" کو مرتب کیا۔ دیباچہ انگریزی میں اور متن اردو رسم الخط میں ہے۔ اس کا ایک ایڈیشن ۱۸۷۳ء میں بھی سامنے آیا۔ یہ کتاب بھی ہندوستانی مترجمین اور شہری حکام کے امتحانی نصاب میں شامل رہی۔ اس کا اصل عربی نسخہ ہندوستان میں ۱۸۱۲ء میں طبع ہوا۔ اس نسخے میں سے چند اقتباسات دیباچے میں بھی شامل کیے گئے ہیں۔ اس مرتبہ نسخے کا مقصد تصحیح شدہ متن تیار کرنا تھا۔ مذکورہ متن کے ساتھ الفاظ کی فرہنگ بھی دی گئی ہے۔

جان ڈاوسن (JOHN DOWSON) نے ۱۸۶۹ء میں "انخوان الصفاء" کا انگریزی ترجمہ "Brothers of Purity" کے عنوان سے کیا ہے۔ اس کا ایک اور ایڈیشن ۱۸۷۵ء میں بھی شائع ہوا۔ اس کا ترجمہ بھی نصابی ضرورت کے تحت کیا گیا ہے۔ اسی لیے ترجمے کو رواں اور قابل فہم رکھنے کی کوشش کا ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلے کے انگریزی تراجم کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے۔ وہ مسٹر جیمز ٹکنسن کے ترجمہ (۱۸۲۹ء)، جو ایک اخبار میں چھپا، کو نامکمل اور مسڑٹی۔ پی۔ منوئل کے ترجمہ (۱۸۶۹ء) کو عام فہم نہیں سمجھتے۔ ڈاؤسن نے، ڈاکٹر فوربس اور ریون کے شائع کردہ مدون نسخے کو بہترین قرار دیا ہے، اور ابواب و اقتباسات کی ترتیب بھی اسی کے مطابق رکھنے کا ذکر کیا ہے۔ "انخوان الصفاء" کا ایک ترجمہ ۱۸۸۵ء میں اے سی کیونڈش نے بھی کیا ہے۔ کیونڈش ہندوستان میں جنوبی ہند اور سری لنکا میں مختلف برانچ بیٹنگوں کے معائنہ کار اور ایجنٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔ انھوں نے یہ ترجمہ کوچین شہر میں کیا اور یہ ترجمہ ایک مقامی اخبار "کوچی آرگس" میں ہفتہ وار ابواب کی صورت میں بھی شائع ہوا۔

ولیم ناسولیس (WILLIAM NASSAU LEES) نے ۱۸۶۳ء میں "آرائش محفل" کو مرتب کیا اور دیباچہ بھی تحریر کیا۔ وہ شیر علی افسوس کو نہایت خوش بیان اور نفیس اسلوب کے مصنفین میں سے سمجھتے ہیں اور ان کی نثر کو ہمیشہ اردو کا معیاری نمونہ سمجھے جانے کا ذکر کیا ہے۔ جان شیکسپیر نے "منتخبات ہندی" میں بھی اسے شامل کیا تھا۔ ناسولیس نے "آرائش محفل" کی پہلی اشاعتوں کے تسامحات کو بھی بیان کیا ہے۔ وہ شیر علی افسوس کی کچھ غلطیوں کو دانستہ قرار دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر شیر علی نے اصل مصنف کا دیباچہ حذف کر دیا تھا اور اپنی طرف سے یہ دعویٰ بھی کر دیا کہ یہ کوئی ترجمہ نہیں بلکہ ایک "تالیف" ہے۔ اس طرح کے معاملات کو وہ ہندوستانی مترجمین کی عمومی خامی تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک ہندوستانی مصنفین اور مترجمین میں ایک عام خامی یہ ہے کہ وہ جن کتب کا ترجمہ کرتے ہیں، ان کے اصل عنوانات کو بدل دیتے ہیں۔ اس عمل کے پیچھے اکثر نیت درست نہیں ہوتی اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اصل مصنف کی علمی حیثیت کو کم کر کے خود مترجم کی بڑائی کو بڑھا دیا جائے۔ ناسولیس کتاب کے اصل

ماخذ "خلاصہ التواریخ" اور اس کے مصنف منشی سجان رائے کا تعارف بھی پیش کرتے ہیں۔ وہ مزید مسلمان مورخین کی اس تاریخ کی طرف کم توجہ دینے پر بھی گرفت کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک یہ امر افسوسناک ہے کہ ابتدائی مسلمان مورخین نے ہندوستان کی اس قدیم تاریخ پر بہت کم توجہ دی۔ اگر وہ ایسا کرتے، تو شاید کئی تاریخی ابہامات کی وضاحت کئی صدیاں قبل ہو چکی ہوتی۔ درحقیقت، بادشاہ اکبر کے عہد تک کوئی خاطر خواہ کوشش نہیں کی گئی کہ مسلمان حکمران ہندوستان کے قدیم بادشاہوں اور ان کی تاریخ سے خود کو واقف کریں۔ اس کے مقابل وہ ہندو مورخین کی تحقیق کی داد دیتے ہیں کہ منشی سجان رائے نے بیس معیاری تاریخی کتب کی فہرست دی ہے جن سے اس نے اپنی تحقیق کے لئے معلومات حاصل کیں۔ وہ اس تفریق کو بار بار واضح کرتے ہیں کہ سجان رائے نے خاص دھیان ہندو بادشاہوں، ان کی تاریخ، مذہبی اور معاشرتی ساخت، فلکیات، قوانین، پہاڑوں، دریاؤں، شہروں، اور عام معاشرتی و نفسیاتی پہلوؤں کی تفصیل پر دیا ہے۔ جسے اسلامی مورخین کی اکثریت نظر انداز کر دیتی یا تیر بہ ہدف کمزور انداز میں پیش کرتی آئی ہے۔ اس پر وہ مزید اپنی خواہش کا اظہار بھی کر دیتے ہیں کہ اس کے فارسی متن کا کوئی اچھا اور معیاری ایڈیشن شائع کیا جانا چاہیے نیز اس کے کئی حصے انگریزی میں ترجمہ کیے جانے کے قابل ہیں۔ اس کے بعد وہ شیر علی افسوس کی مترجمہ کتاب کی مزید وضاحت کرتے ہیں کہ پوری کتاب کا اسلوب یکساں نہیں ہے۔ کتاب کا پہلا حصہ خاصی خوبصورتی سے لکھا گیا ہے جبکہ دوسرا حصہ لفظ بہ لفظ ترجمہ ہے اور اس کا اسلوب سادہ اور عام زبان پر مبنی ہے۔ بد قسمتی سے، ساری کتاب میں اسماء (ناموں) کی درستگی پر کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ وہ اسے ایک غیر معیاری متن قرار دیتے ہوئے اپنی محنت کا اظہار کرتے ہیں کہ انھیں کس طرح معیاری متن تیار کرنے کے لیے مختلف تاریخوں اور درجنوں نقشوں سے مدد لینی پڑی ہے۔

ایم کی مپسن نے ۱۸۸۴ء میں "توبہ النصوح" کا انگریزی ترجمہ کیا۔ انھوں نے اس ترجمے کی تین وجوہات بیان کی ہے:

"اول: اس لیے کہ مجھے یقین ہے کہ ہمارے ہندوستانی ہم وطنوں کی حالت اور ترقی کے بارے میں جو خیر خواہی اور ہمدردی انگریزوں کے دلوں میں موجود ہے، وہ اس کہانی کے مطالعے سے مزید بڑھے گی۔
دوم: کیونکہ یہ قصہ ہندوستانی عوام کی گھریلو زندگی اور رہن سہن پر جو روشنی ڈالتا ہے، وہ ان تمام افراد کے لیے مفید ہوگی جو ہندوستان میں ملازمت کر رہے ہیں یا آئندہ کرنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔
سوم: کیونکہ یہ اب تک شائع شدہ کہانیوں میں سے بہترین نمونہ ہے اس زبان کا، جو ہندوستانی زبانوں میں سب سے زیادہ بولی جاتی ہے۔ یعنی ہندوستانی زبان، جیسی کہ دہلی (جو اس کہانی کا پس منظر ہے) میں بولی جاتی ہے" (6)

ایم کی مپسن کے نزدیک اس کہانی کی اہمیت اس لیے بھی ہے کہ اس میں مقامی فرد نے ہندوستانیوں کے طور طریقوں اور گھریلو معاشرت کی عکاسی کی ہے۔ مولوی نذیر احمد کا تعارف کرواتے ہوئے ان کی انگریزوں کی حکومت میں طویل عرصے کی وابستگی کا خصوصاً ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ولیم میور کا دیباچہ دیا گیا ہے۔ ولیم میور نے ہندوستانیوں کے مقامی ادب میں مفید اور دلچسپ ادب کی

برطانوی مستشرقین کے ہندوستانی (اردو) نثری متون کے تراجم اور تدوین: تحقیقی تناظر

کمی کی شکایت کی ہے اور جو تھوڑا بہت لکھا بھی گیا ہے اسے بھی نامناسب یا غیر اخلاقی قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک مثال کے طور پر، نوجوانوں یا خواتین کے لیے تعلیم و تفریح پر مبنی اچھی کہانیوں کا تقریباً کوئی وجود نہیں۔ اس کے بعد اس کتاب کو انعام دینے کے لیے ایم کی مپسن کی سفارشات لکھی گئی ہیں۔ ان سفارشات میں؛ دہلی کی عام بول چال میں ہندی، فارسی اور عربی کے الفاظ کا نہایت خوبصورت استعمال، ضرب الامثال، شعری اشعار، اور روزمرہ کی زبان میں آنے والے جملے کے بیان میں مہارت، مسلمانوں کی گھریلو زندگی کی تفصیلات کا افادی اظہار شامل ہے۔۔۔ اس کتاب کی سب سے نمایاں خصوصیت اس کا مذہبی پہلو، جس کے تحت ہندو اور عیسائی قارئین بھی اس سے سبق حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کہانی کا مرکزی خیال یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ مذہبی اقدار پر عمل کرنا ہی گھریلو خوشیوں کی اصل بنیاد ہے۔ ولیم میور نے اس ترجمے کی بھی تعریف کی ہے۔ وہ قصے کے بارے میں اپنی رائے دیتے ہوئے بھی اس کے مذہبی پہلو ہی کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس کتاب کا ایک اور بڑا فائدہ یہ ہے کہ یہ اسلام کے ان پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے جو نیکی کے فروغ اور بدی کی روک تھام پر زور دیتے ہیں۔ عام طور پر مسلمان مذہبی کتابیں رسمی احکام و عبادات پر ہی مشتمل ہوتی ہیں، مگر یہاں مذہب کو گھریلو زندگی کا رہنما بنایا گیا ہے۔ وہ مذہبی نقطہ نظر میں اس تبدیلی کو ہندوستان میں موجود عیسائی اثرات کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔

جے ای وارڈ (J.E. WARD) نے ۱۸۹۹ء میں مراۃ العروس کو مرتب کیا۔ اسے رومن رسم الخط میں لکھا گیا ہے۔ اصل کہانی کے دیباچہ اور تعارف کا انگریزی ترجمہ دیا گیا ہے۔ کہانی کے بارے حواشی دیے گئے ہیں اور آخر پہ فرہنگ بھی مرتب کی گئی ہے۔ اس ناول کے مرتب جے ای وارڈ نے طویل دیباچہ تحریر کیا ہے۔ اس ترتیب کا مقصد انگریز خواتین کے لیے متن سامنے لانا ہے جو اردو زبان سیکھنا چاہتی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں خواتین کی فطری دلچسپی کے عناصر بھی موجود ہیں۔ رومن رسم الخط کے لیے ولیم ہنٹر کے طریقہ کو اپنایا گیا ہے۔ ترتیب کے لیے اپنے وضع کردہ اصولوں کی بھی وضاحت کی ہے۔ مثال کے طور پہ کہ ہر سطر میں الفاظ کو اس انداز سے رکھا ہے کہ مرکب جملے یا ذیلی الفاظ با آسانی پہچانے جا سکیں۔ ہندوستان میں سب سے زیادہ بولی جانے والی زبان کی اہمیت واضح کی ہے اور اس کے دور رسم الخط کی بات کی ہے۔ انھوں نے ہندی اور اردو دونوں کو ایک زبان قرار دیا ہے اور ابتدائی یورپین کے ان زبانوں کو الگ الگ سمجھنے کو غلط فہمی کہا ہے۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر رومن رسم الخط کو اردو ہندی دونوں کے متبادل کے طور پر کر دیا جائے تو اردو ادب میں موجود یکجہتی کا گمشدہ رشتہ دوبارہ قائم کیا جاسکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی وہ دونوں رسم الخط کی اپنی اہمیت کی نفی بھی نہیں کرتے۔

مستشرقین نے جن متون کے انگریزی تراجم کیے وہ زیادہ تر وہ کتب تھیں جو فورٹ ولیم کالج کے تحت منظر عام پر آئیں اور نصاب کا حصہ تھیں۔ ان تراجم میں توجہ اور محنت کا مطمح نظر طالب علموں کے لیے آسانی اور سہولت رہی۔ حواشی اور دیگر تفصیلات بھی اسی سلسلے کی اگلی کڑی رہی۔ مرتبہ متون میں اردو رسم الخط کے ساتھ رومن رسم الخط اور فرہنگ کا اہتمام کیا جاتا رہا۔ تراجم اور

مرتبہ نسخوں کے دیباچوں میں مصنفین اور زیر نظر کتب کا تعارف موضوع رہا ہے۔ البتہ کچھ مستشرقین نے ان متون کی اہمیت کو بھی بیان کیا ہے۔ کچھ کے ہاں ان متون کی نسبت استعماری زاویہ نظر بھی ابھرا ہے۔ کہیں کہیں مشرقی علم و ادب کو سراہا گیا اور کہیں انھیں کم علم، ناواقف اور توہم پرست بھی گردانا گیا ہے۔ اس مطالعے میں یہ چیز بھی واضح ہوئی ہے کہ مستشرقین کے ہاں ہندوستانیوں اور مشرقی علم و ادب کے بارے متضاد اور مختلف نقطہ نظر بھی ملتا ہے۔

References

1. Smith, L. F. The tale of the fourth Durwesh (Calcutta: Rozario, 1850), vi.
2. Eastwick, E. B. The Bagh-o-Bahar (Hertford: Stephen Austin, 1851), xi.
3. Smyth, W. C. The Lutaifi Hindee (London: W. Nicol, 1821), v.
4. Roebuck, T., Muzhabi Ishq (Calcutta: Hindoostanee Press, 1815), iii.
5. Small, G. The Tota Kahani (London: Allen & Co., 1875), viii.
6. Kempson, M. The Repentance of Nussooh (London: Allen & Co., 1884), v.